دور جدید کا فکری چیلنج اور دینی مدارس

پروفیسر ڈاکٹر حافظ شبیر احمد جامعی

یورپ میں جس نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور تشکیل جدید (Reformation) کی تحریک کا آغاز چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں اٹلی سے ہوا، بہت جلد اس کے اثرات یورپ کے دیگر ممالک میں پھیل گئے۔

جس طرح اطالیہ (Italy) میں یونان کے قدیم علوم کی حیات ثانی (Rebirth) کی تحریک چلی، ایسے ہی فرانس، جرمنی وغیرہ میں، کلاسیکی ادب، فن تعمیر، موسیقی اور دیگر علوم کے احیاء کی تحریک، احترام آدمیت (Humanism) کی معصوم اصطلاح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اسی ردعمل کی بازگشت، جرمن عیسائی مفکر مارٹن لوتھر کے معاصر، اراسمس (Erasmus) کی تحریروں میں رونما ہوئی اور بہت جلد تقلید پسند عیسائیت کی گرفت، معاشرے کے ذی شعور اور صاحب فکر افراد پر ڈھیلی پڑنی شروع ہوگئی۔ ارسطو، افلاطون اور دیگر فلاسفہ اور متکلمین کی فکر، بابائے روم کے مقابلے میں زبان زدعام ہونے لگی۔ یونانی فکر کی یہ حیات ثانی، زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوئی۔ نتیجتاً بدید یورپی انسان نے اپنے تصور، اخلاق، معاشرت، معیشت وقانون، ہر شعبہ حیات سے مقلدانہ عیسائیت کو خارج کرکے ایک لادینی طرز عمل اختیار کرنا شروع کیا۔

سولھویں صدی میں مسلم دنیا سے روابط اور تبادلہ فکر کے نتیجے میں یورپ میں ایک علمی وفکری انقلاب کا آغاز تو ہو چکا تھا۔ تجرباتی علوم اور علوم عقلیہ کی ترقی پذیری کے ساتھ، جامد مذہبیت زوال کی طرف جانا شروع ہوئی۔ اس عرصے میں طبیعیاتی، حیاتیاتی اور کیمیاوی علوم میں درختوں نے، مذہب کے مقابلے میں ایک لادینی (سیکولر) رجحان کو پروان چڑھانے میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بہت جلد وہ کلیسا جو کل تک ہر معاملے میں حرف آخر تھا، اب اپنی چار دیواری میں بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ کارزار حیات سے اس کا اثر برق رفتاری کے ساتھ کم ہونا شروع ہوگیا اور ''انسان دوستی'' (Humanism) کے نام پر مذہب سے عاری ایک لادینی طرز فکر میدان حیات میں فتح مندی کے جذبے کے ساتھ آگے بڑھنا شروع ہوا۔ اسی دور میں یورپ کی عسکری اور سیاسی قوت میں اضافہ ہوا اور اس کی مقابل دوسری قومی ومذہبی قوتوں کے اضمحلال، سیاسی طوائف الملوکی، اخلاقی زوال اور معاشی طور پر دوسروں پر انحصار کا نتیجہ یہ نکلا کہ لادینیت پرست یورپی استعماری قوتوں کو دنیا کے ایک وسیع وعریض خطے، خصوصاً مسلم ممالک پر اپنا تسلط قائم کرنے کا موقع ملا۔

اپنی زبوں حالی اور یورپی سامراج کی چمک دمک سے متاثر ہوکر بہت سے اہل علم نے یہ عاجلانہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''ترقی اور لادینیت میں ایک منطقی ربط ہے''۔ چنانچہ جس طرح مغرب نے بظاہر یونانی فکر کی حیات ثانی کے ذریعے مقام ترقی حاصل کیا تھا، ان مفکرین نے بھی دین اسلام کو، عیسائی تقلید پسند مذہبیت کے مشابہ ومساوی قرار دیتے ہوئے اور بقیہ کاروبار حیات کو دنیاوی عمل قرار دیتے ہوئے، انسانی عقل کو اپنے لیے خود ضابطہ تجویز کرنے کا حق دے دیا۔ گویا سیاست، معیشت، قانون، تعلیم اور معاشرت کو دنیاوی سرگرمی قرار دیتے ہوئے ''روحانی'' اور ''مذہبی'' پابندیوں سے آزاد سمجھ لیا گیا۔ انھوں نے یہ اصول تسلیم کرلیا کہ دنیاوی معاملات میں دنیا والوں کے انداز اختیار کیے جائیں اور اگر ضرورت ہو تو نکاح، طلاق اور وراثت جیسے ذاتی معاملات میں جہاں تک ہوسکے مذہبی ضابطوں پر عمل کیا جائے۔

مغرب نے مذہب سے اپنی آزادی کی تحریک کو ''جدیدیت'' (Modernism) کا نام دیا اور بظاہر تجدید وتجدد میں کوئی بنیادی فرق نہ کیا۔ تجدد کے زیر عنوان عیسائیت کے تصور خدا پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے، الوہیت کے دائرہ کار کو کلیسا میں محدود کردیا۔ اس کے بعد نہ صرف ادب، فلسفہ اور فنون میں مشرکانہ اور اصنام پرست یونانی طرز فکر رائج کیا، بلکہ عملاً عیسائیت کے لطور ایک مذہب، بساط لپیٹنے کا باضابطہ اعلان کردیا۔ عصر حاضر کی اس نئی بساط کے لیے کچھ نئے قواعد وضوابط کا تعین بطور ایک متبادل نظام کے بھی کردیا گیا۔

اب ایک نئی دنیا اور نئے دور کے وجود میں آنے کے ساتھ اخلاق، قانون، معاشرت، معیشت، ثقافت اور سیاست میں انسان کی اپنی رائے، اس کا اپنا فیصلہ، اس کی اپنی عقل حرف آخر قرار پائی۔ نظام کلیسا کی پاپائیت (برہمنیت) کی مرکزی قیادت کے اختیار کے ساتھ عیسائیت کے الوہی نظام کو بھی معلق ومعطل بلکہ برخواست کردیا گیا۔

نئے بازی گروں نے اس نئے دور میں، سائنسی ترقی، عقل پرستی، انفرادیت پرستی اور مادہ کی بالادستی کو جزو ایمان قرار دیتے ہوئے، کلیسا کی حکومت (Theocracy) کی جگہ لادینی جمہوریت (سیکولر ڈیموکریسی) کو دور جدید کے مثالی نظام کے طور پر پیش کیا۔ ترقی اور عقلی رویے کو صرف اور صرف لادینی جمہوریت کے ساتھ وابستہ کردیا گیا اور ایک نئی معاشی دنیا کی تعمیر کی بنیاد رکھی گئی۔

مسلمان دانشوروں کے ایک طبقہ نے اپنی فکری اور ثقافتی پسماندگی وزبوں حالی کے پیش نظر، اس چڑھتے ہوئے مغربی سورج کے سامنے اپنے فکری احساس کمتری کی بنا پر، خود آگے بڑھ کر نیک خواہش اور تمنا کے ساتھ فکری غلامی کے کنگن اپنے ہاتھوں میں پہن کر اپنی شخصیت کی تکمیل کرنا چاہی۔ جب کہ ایک دوسرے طبقے نے تحفظ ذات کے لیے لادینیت کے اس سیاہ بادل اور اس کی گرج چمک سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کرکے خود کو ماحول ومعاشرہ سے غیر متعلق کرنے اور ماضی کی روایات کو سینے سے لگانے اور دانتوں سے پکڑ لینے کو اپنا کمال سمجھا۔

اسلامی تہذیب وتمدن کا یہ ایک قابل غور پہلو ہے کہ جب بھی وہ فکری، اخلاقی، سیاسی اور معاشی زوال کا شکار ہوئی ہے خود اس کے اندر ایک ایسی تحریک ابھری ہے جو اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کا سبب بن گئی۔ عصر حاضر میں

مغرب کے لادینی تسلط وتصورات نے اسلامی تہذیب کی اس صلاحیت کو پھر موقع فراہم کیا ہے۔ ہمیں یہ بیسویں صدی کے لیے اگر کوئی نمائندہ عنوان تجویز کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف ''تحریکات احیائے اسلام کی صدی'' ہے۔

یہ احیائے اسلام جہاں امت مسلمہ کے لیے خود اعتمادی کے حصول اور احساس کمتری سے نجات کا سبب بنا، وہیں مغربی مفکرین اور تجزیہ نگاروں کے لیے احیائی تحریکات، فکری تشویش بلکہ گہرے فکری مغالطے اور مستقبل کے اندیشوں کا سبب بن گئیں۔

اس وقت دنیائے اسلام جس دور سے گذر رہی ہے، یہ دور اسلام کی تاریخ کا انتہائی مشکل اور کٹھن دور ہے۔ امت مسلمہ کو جو مشکلات آج درپیش ہیں۔ شاید ماضی میں اتنی مشکلات کبھی درپیش نہیں ہوئیں۔ ایک اعتبار سے امت مسلمہ کی پوری تاریخ بحرانوں کی تاریخ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کے آغاز سے لے کر، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دارارقم میں قیام فرما تھے، آج تک کوئی صدی اور صدی کا کوئی حصہ یا کوئی عشرہ ایسا نہیں گذرا جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ اس میں مسلمانوں کو کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ لیکن ان ساری مشکلات میں اور آج کی مشکلات میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے۔ ماضی کی جتنی مشکلات اور پریشانیاں تھیں وہ عموماً زندگی کے کسی ایک گوشے تک محدود ہوتی تھیں۔ مسلمانوں کو عسکری اعتبار سے کسی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا، پیچھے ہٹنا پڑا، پسپائی اختیار کرنا پڑی، یہ ایک عسکری شکست یا عسکری ہزیمت کا معاملہ تھا یا مسلمانوں کی کوئی حکومت کمزور ہوئی، غیر ملکی قوتیں مضبوط ہوگئیں اور مسلمان سیاسی طور پر پسماندگی کا شکار ہوئے۔ یہ سیاسی میدان میں کمزوری تھی۔ اس طرح کی کمزوریاں جو عموماً سیاسی، مالی، عسکری یا مادی ہوتی تھیں، تقریباً ہر دور میں پیش آتی رہیں۔ لیکن ان سارے ادوار میں مسلمانوں کا خاندان، مسلمانوں کی تعلیم، مسلمانوں کا نظام تربیت اور مسلمانوں کی جو اندرونی ساخت اور تشکیل (Internal Fabric) تھی، وہ اکثر و بیشتر بیرونی خطرات اور حملوں سے محفوظ رہی۔ تاتاریوں کے حملے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیائے اسلام پر اس سے برا وقت کبھی نہیں آیا، اور یقیناً وہ برا وقت تھا کہ افغانستان کے مشرقی علاقوں سے لے کر مصر کے حدود تک اور ترکی کے جنوبی علاقوں سے لے کر جزیرۃ العرب کے وسط تک، یہ سارا علاقہ تاتاریوں کی تاخت وتاراج کی آماجگاہ تھا۔ انھوں نے ہزاروں علماء کرام کو شہید کیا اور بڑے بڑے جید ترین اکابر اسلام ان کی تلوار کا نشانہ بنے۔ خواجہ فریدالدین عطار جن کے بارے میں مولانا روم نے فرمایا:

عطار او بود و سینائی دو چشم او ما از پئے سینائی و عطار آمدیم

اس درجے کے انسان کہ جن کی پیروی پر مولانا رومؒ جیسے آدمی نے فخر کا اظہار کیا ہے، ایسے اونچے اونچے لوگ تاتاریوں کی تلوار کا شکار ہوئے۔ کتب خانے انھوں نے جلا دیئے، شہر برباد کردیئے، یہاں تک کہ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی شکست خوردگی اور پست ہمتی کا یہ عالم تھا کہ: '' إذا قيل لك أن التتار انهزموا فلا تصدق ''یعنی اگر تمھیں یہ خبر دی جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہوگئی ہے تو اس پر یقین نہ

کرو۔ گویا تاتاریوں کی شکست ناقابل تصور سمجھی جاتی تھی اور یہ بات ضرب المثل بن گئی تھی۔ لیکن اس ساری تباہی اور بربادی کے باوجود، تاتاریوں کی شکست وریخت کا دارومدار، سارا کا سارا مسلمانوں کی عسکری اور سیاسی کمزوری پر تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو سیاسی نقصان پہنچایا، عسکری نقصان پہنچایا، لیکن ان کے پاس کوئی دین نہیں تھا، کوئی پیغام نہیں تھا، کوئی تہذیب نہیں تھی، کوئی مذہب نہیں تھا، کوئی فکری ایجنڈ انہیں تھا جو مسلمانوں کے لیے چیلنج بنتا۔ اس لیے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، تربیت اور خاندانی نظام ان کے حملوں سے محفوظ رہا اور ان میں سے کوئی چیز متاثر نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی اندرونی قوت نے ان کا ساتھ دیا اور بہت جلد وہ تاتاریوں کی شکست کے نتائج وثمرات بد سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہی کیفیت بقیہ بہت سے معاملات کی بھی رہی۔

آج جو صورت حال درپیش ہے اور آج نہیں، پچھلے ڈیڑھ سو سال سے درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ ہر آنے والا دن، ہر نکلنے والا سورج، خطرے کی یا پریشانی کی ایک نئی جہت لے کر آتا ہے۔ آج اسلامی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو خطرات سے دوچار نہ ہو۔ فرد کے ذاتی کردار اور تربیت کا معاملہ ہو، گھر کے اندر ماں اور بچوں کے درمیان کا معاملہ ہو، میاں بیوی کے تعلقات کا معاملہ ہو، گھر کی خواتین کے رویے کا معاملہ ہو۔ تعلیم وتربیت کا معاملہ ہو، یا مساجد کے اندر جاری سرگرمیوں کا معاملہ ہو، ان میں سے ہر چیز آج براہ راست مغربی حملے کی زد میں ہے۔ تاتاریوں نے شاید کبھی یہ نہ پوچھا ہوگا کہ جامعہ ازہر میں کیا پڑھایا جارہا ہے، مسلمانوں کی نصاب کی کتابوں میں کیا لکھا جارہا ہے، یا فقہ کی کتابوں میں کیا لکھا ہے، یا دینی مدارس میں کیا معمولات ہیں۔ انھوں نے کبھی یہ چیز زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح انگریز جب شروع میں یہاں آئے تو انھوں نے بھی ان معاملات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز کے ڈیڑھ دو سو سال یہاں رہنے کے باوجود مسلمانوں کی اندرونی ساخت (by and large) مغربی اثرات سے محفوظ رہی اور ایسے لوگ ہزاروں نہیں، لاکھوں کروڑوں تھے، جن کی زندگی کا ایک لمحہ یا ایک گوشہ بھی انگریزی اثرات سے متاثر نہیں ہوا۔

پس منظر۔ مضمرات: بیسویں صدی کے نصف میں محکوم قوتوں میں آزادی کی ایک زبردست تحریک پیدا ہوئی جس نے انتہائی محدود عرصے میں استعماری قوتوں کو اس قدر مضمحل اور مجبور کردیا کہ وہ آزادی کی تحریکوں کے سامنے سپر انداز ہوگئیں اور صدیوں تک غلام رہنے والی اقوام کو آزادی کی نعمت میسر آئی۔

مگر صدیوں کی غلامی نے انھیں اپنے علمی، ثقافتی اور تہذیبی اقدار سے ناآشنا اور بیگانہ کردیا تھا۔ استعمار نے نہ صرف ان کی آزادی پر شب خون مارا تھا بلکہ ان کی علمی کاوشوں کو بھی سبوتاژ کر کے رکھ دیا۔ علامہ اقبالؒ اسی پس منظر میں نوحہ کناں ہیں کہ:

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی　　نہیں دیا کے آئین مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی　　جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

زبوں حالی اور غلامی کے اس عہد میں ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت، قدرت اور تدبیر کے تحت اپنے دین کی حفاظت کا اہتمام اور کفار کی یلغار سے، اور استعمار کی دستبرد سے بچانے کا انتظام کچھ اس طرح فرمایا کہ امت کے اصحاب علم اور دین کے بہی خواہوں کے دل میں دین کی بقاء اور علوم دینیہ کے احیاء کا جذبۂ بیکراں پیدا کر دیا۔ جنھوں نے رضا کارانہ طور پر ہر نوع کی مشکلات اور رکاوٹوں کے علی الرغم، اپنی مدد آپ کے تحت، دینی علوم کے ادارے قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا، جس نے بہت کم عرصہ میں دینی علوم کے احیاء کی ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اہل دل اور اہل خیر کے تعاون سے پورے برصغیر میں دینی مدارس کا ایک جال بچھا دیا۔

کسی طرح کی سرکاری اعانت قبول کیے بغیر، محض اہل خیر کے عطیات اور صدقات وخیرات سے ان کا نظم ونسق چلتا رہا اور اس طرح ان دینی تعلیمی اداروں نے نہ صرف اسلامی علوم کی بقاء اور اسے استعماری دستبرد سے بچانے کے لیے اہتمام کیا، بلکہ بتدریج یہ ادارے علوم دینیہ کی نگاہ بانی کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے قلعے اور مراکز بھی بن گئے۔ ان اداروں نے ایسے ایسے افراد تیار کیے کہ باید وشاید، گذشتہ دو صد سالہ تاریخ کا اگر علمی جائزہ لیا جائے، تو بلاشک وریب کہا جاسکتا ہے کہ ان دینی درس گاہوں نے علوم دینیہ کی حفاظت وصیانت کا حق ادا کر دیا اور اس روشنی کو برصغیر سے نکال کر اقصائے عالم تک پہنچا دیا۔

ان اداروں نے ایسے یگانہ روزگار افراد مہیا کیے جنھیں اہل شعور ودانش نے بجا طور پر اپنے عہد کے ابوحنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ، ابن تیمیہؒ، غزالیؒ اور رازیؒ قرار دینے میں فخر محسوس کیا، اور ساتھ ساتھ انہی دینی اداروں کے توسط سے اس آخری دور میں اسلام کے ایسے نامور مفکر اور احیائے اسلام کے داعی بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور قلم و قرطاس کی جگمگاتی تحریروں سے اسلام کے روئے تاباں پر عہد غلامی کی پھیلائی ہوئی جاہلیت اور خجالت کی تاریکیوں کو اجالوں میں بدلنے کی سعی پیہم کی، جس کے نتیجہ میں امت مسلمہ میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی۔ اپنی خودی، خودشناسی اور خودآگہی کے جذبوں نے جنم لیا اور اس طرح علامہ اقبالؒ کی یہ تمنا کہ:

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی　　دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

آخر مسلمانوں کی پریشاں نظری کا علاج قرآن وسنت کی حکیمانہ تعلیمات کے علاوہ اور کہاں میسر آسکتا ہے؟

تاریخ کی یہ بے لاگ شہادت ہمارے سامنے ہے کہ جن ممالک میں جس حد تک دینی تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے وہاں دینی علوم، دینی تہذیب اور دینی روایات زندہ وتابندہ رہیں۔ معاندانہ قوتوں کو پسپائی اور نامرادی کا سامنا کرنا پڑا اور جہاں کہیں دینی مدارس اور دینی تعلیم کے اہتمام میں کمی واقع ہوئی۔ اسی نسبت سے دینی علوم میں اضمحلال اور دینی وابستگی میں کمی ہوتی چلی گئی۔ لہٰذا یہ امر مسلم ہے کہ اگر دین کو اپنی اصلی ہیئت اور ماہیت کے ساتھ برقرار رکھنا ہے اور اباحیت

پسندوں اور نام نہاد دانشوروں کی دستبرد سے بچانا ہے، تو ناگزیر طور پر دینی علوم کے ان اداروں کو نہ صرف مستحکم اور مضبوط بنانا ہوگا جو مختلف حیلوں، بہانوں سے ان اداروں کے درپے آزاد ہیں۔

جب کہ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ عصر حاضر کی مسلمان حکومتیں نہ صرف ان دینی اداروں کے تعاون سے دست کش رہنے کی عہد غلامی کی فسطائی اور جارحانہ روش پر قائم ہیں بلکہ ان کا وجود تک مٹانے کی منصوبہ سازیاں کی جارہی ہیں اور ایسے مذموم عزائم کی نشان دہی ہورہی ہے کہ اگر خدانخواستہ انھیں کھل کھیلنے کا موقع دیا گیا تو وہ بہت جلد، ان دینی مدارس کی آزادی وخودمختاری پر کاری ضرب لگانے کے لیے پرتول رہے ہیں، جس کے بعد ان دینی اداروں کو یا تو حکومت کا آلہ کار اور پشتیبان بن کر رہنا ہوگا یا اپنا وجود اور ان کی حقیقی افادیت سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

اسلامی نظام کی تنفیذ وتعلیم: کسی قوم کا اہم فریضہ، اپنے نظام کی تنفیذ اور تعلیم ہوا کرتا ہے۔ امت مسلمہ کا نظام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نظام کی تعلیم دی، اس کی تنفیذ فرمائی ''ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ''۔ سورہ توبہ، سورۃ الفتح اور سورہ الصف، ان تینوں سورتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا یہی مقصد بیان کیا گیا ہے اور بشارت دی گئی ہے کہ کفار ومشرکین کی ناپسندیدگی، مخالفت اور رکاوٹ کے باوجود اللہ تعالیٰ اس دین کو تمام ادیان باطلہ پر غالب فرمائیں گے۔

امت کو یہ نظام آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثت میں ملا۔ خلافت راشدہ، خلافت بنوامیہ، بنوعباس اور بنوعثمان میں افریقہ کے صحراؤں سے لے کر شیشان کے پہاڑوں تک، بوسنیا سے لے کر چین کی دیواروں تک، پھیلی ہوئی عظیم الشان مملکت، اس کے تمام صوبے اور ادارے اسی نظام کے تحت چلتے تھے۔ ریاست کے تمام حصوں میں عظیم الشان تعلیمی ادارے کتاب وسنت، فقہ اسلامی، علوم عربیہ اسلامیہ اور علوم عقلیہ کی تعلیم سے معاشرے کو منور کر رہے تھے۔ علوم عربیہ و اسلامیہ کے زیور سے آراستہ ایسے علماء اور فقہاء، اور ماہرین علوم اس نظام تعلیم کے ذریعہ سامنے آتے ہیں، جن کا نام لینے سے اہل اسلام کا سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے۔ صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ، مجتہدین، محدثین ومفسرین اور متکلمین اسلام پر مشتمل عظیم الشان سلسلۃ الذہب کا نمونہ کوئی قوم پیش نہیں کرسکتی۔

فقہ اور علوم وفنون کا جو ذخیرہ امت مسلمہ نے پیش کیا ہے، علم وتحقیق، اجتہاد وایجاد کی دنیا میں بھی اس کی نظیر کوئی نہیں پیش کرسکتا:

أولئك ابائی فجئنی بمثلھم إذا جمعتنا یا جریر المجامع

حقیقت یہ ہے کہ بعثت نبویؐ سے پہلے کا دور، دور جاہلیت تھا، اور آپؐ کے بعد کا دور، دور علم وہدایت ہے۔ احادیث میں بعثت سے پہلے کے دور کو، دور جاہلیت قرار دیا گیا ہے اور اس پر علمی دنیا کا اتفاق ہے۔

یہی وہ اصل علم ہے جو امت مسلمہ کا امتیاز اور اس کا اصل تشخص ہے اور یہی وہ نظام ہے جو محسن انسانیت حضرت محمد

صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔ اسی نظام تعلیم کے تیار کردہ عبقری لوگوں نے بارہ سو سال تک خلافت اسلامیہ کے نظام کو کامیابی سے چلایا۔

دور غلامی اور اسلامی نظام کی تنسیخ: صیہونی اور صلیبی سازشوں اور مسلمان حکمرانوں کی غفلت، باہمی بغض وحسد اور ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیوں اور فسق وفجور میں مبتلا ہونے کی وجہ سے، عظیم الشان خلافت اسلامیہ کا خاتمہ ہوگیا اور اکثر مسلمان ممالک استعماری طاقتوں کی غلامی سے دوچار ہوگئے۔ برصغیر پاک وہند برطانوی استعمار کے زیر تسلط آ گیا۔ استعماری طاقتوں نے جن مسلم ممالک پر قبضہ کیا وہاں پہلے سے رائج شرعی نظام قانون، اور اسلامی نظام تعلیم کو کلیتہً ختم کر کے اس کی جگہ اپنی زبان، اپنا نظام قانون ومعاشرت رائج کیا۔ کتاب وسنت، فقہ اسلامی اور علوم عربیہ ودینیہ کی تعلیم کو ختم کر دیا۔

تحریک آزادی وجہاد اور دینی مدارس: یہ دینی مدارس کے تیار کردہ علماء کرام ہی تھے جنھوں نے استعمار کا دن رات مقابلہ کیا اور اسے ایک دن بھی چین سے نہیں سونے دیا۔ اس کے خلاف جہاد کیا اور جہاد وآزادی کی تحریکوں کو منظم کیا جس کے نتیجے میں وہ اسلامی ممالک سے بھاگ نکلنے پر مجبور ہوگیا۔ اولین دینی مدرسہ ''صفہ'' سے لے کر آج تک ہر دور میں دینی مدارس اسلام کے قلعے، دین، ملت اور وطن کے تحفظ کی ضمانت اور جہاد وآزادی کی تحریکوں کا مرکز ومحور رہے ہیں اور دینی رہنمائی عوام نے ''مُلّا'' کو چھوڑ کر کبھی ''مسٹر'' کی پیروی نہیں کی۔ ''مُلّا'' جس کو دین سے بغض وعداوت رکھنے والے طبقوں نے بالکل ایک گالی بنا کر رکھ دیا ہے، آج بھی عوام کی توجہ کا مرکز ہے۔ وہ حلال کو حرام سے ممیز کرنے کے لیے، جائز وناجائز کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کے لیے، حق وباطل کے درمیان فرق کرنے کے لیے، عبادات ومعاملات میں شریعت کے احکام معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ ''مُلّا'' ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسی کی بات پر اعتماد کرتے ہیں۔

دوسرے ممالک کو تو فی الحال نظر انداز کیجیے، صرف پاک وہند میں جو نامور ''مسٹر'' پیدا ہوئے ہیں ان کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالیے اور پھر دیکھیے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی امت نے مفتی تسلیم کیا ہے؟ سرسید کو قوم سے جو محبت اور دین سے جو وابستگی تھی اُس سے کس کو اختلاف ہوسکتا ہے۔ انھوں نے دین کی حمایت میں بعض قیمتی چیزیں بھی لکھیں اور امت نے ان کے کام کو سراہا بھی۔ مگر عقائد واحکام کے کسی مسئلے میں بھی ان کا فتویٰ جاری نہ ہوسکا۔ سید امیر علی، مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک، اپنی ساری فضیلت اور خدمات کے باوجود یہ مقام حاصل نہ کر سکے۔ ان کے کام کو جو لوگ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، خود ان کو بھی جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کا حکم معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو انھوں نے اپنے ملک کے معروف علماء دین ہی کی طرف رجوع کیا۔ خالص دینی معاملات تو ایک طرف رہے، آپ کی یہ تحریک پاکستان بھی اس وقت تک عوام میں مقبول نہ ہوسکی، جب تک مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور اسی طرح کے دوسرے ''ملاؤں'' نے اس کے حق میں فتوے صادر نہ کیے۔

علامہ اقبال کی روشن دماغی، ملت خیر خواہی، دینی بصیرت اور جدید تقاضوں کی سمجھ بوجھ میں کسے شک ہوسکتا ہے؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں بھی کسی دینی مسئلے کے سمجھنے میں جب کوئی دقت پیش آتی ہے تو وہ سرراس مسعود یا سراکبر حیدری یا خود قائداعظم سے استفسار کرنے کے بجائے ''ملائی نظام'' کے ایک چشم وچراغ علامہ سید سلمان ندویؒ پر اعتماد کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ ان ''ملاؤں'' کے کس قدر گرویدہ تھے، اس کا اندازہ مکاتیب اقبال سے بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

یہاں کتنے اسکول، کالج اور یونی ورسٹیاں نوخیز نسلوں کو مغربی تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور ان پر خزانہ سرکار کی اس آمدنی کا اربوں روپیہ صرف ہورہا ہے، جس کی فراہمی میں ''مُلّا'' کا حصہ بھی ہے۔ ''ملا'' نے اس پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ مگر اس کے مقابلہ میں ''مُلّا'' کو تنگ نظری کا طعنہ دینے والے عالی ظرف ''مسٹر'' کو یہ بات بھی گوارا نہیں ہے کہ ''مُلّا'' حکومت کے خزانے پر ایک پائی کا بوجھ ڈالے بغیر صرف عوام کے چندوں سے دینی تعلیم ترویج واشاعت کا انتظام کرے، اور روکھی سوکھی کھا کر دینی مدرسے چلائے۔

اصل بات یہ ہے کہ مغرب زدہ طبقے کے نزدیک اچھائی اور برائی کا معیار یورپ اور امریکہ ہے۔ وہ زندگی کے معاملات کا جائزہ مغربی اقدار حیات کے نقطۂ نظر سے لیتا ہے اور پھر ان کے مطابق ہر کام کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ وہ خواہ زبان سے یہ بات نہ کہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس کے نزدیک کوئی رہنما ضابطہ حیات نہیں ہے۔ یہ جس حد تک مغربی تہذیب وتمدن کے ساتھ ہم رکاب ہوکر چل سکے، اس حد تک تو گوارا ہے اور جس مقام پر ان دونوں کے راستے مختلف ہوں وہاں سے مغرب زدہ طبقہ اُسے چھوڑ کر مغرب کی پیروی اختیار کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے اس طرز عمل پر وہ عوام میں ہدف ملامت نہ بنے، اس لیے اسلام کو اپنے پیچھے گھسیٹنے کی مذموم کوشش کرتا ہے اور اس کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریات کے مطابق ڈھالتا ہے۔ پھر جب دین کا علم رکھنے والے اس پر ٹوکتے ہیں اور ناقابل انکار دلائل سے ان کی من مانی تاویلات وتعبیرات کی غلطی واضح کرتے ہیں تو یہ جبر سے کام لے کر ان کو دباتا ہے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کہتا ہے کہ اسلام کی تعبیر کا حق کوئی مُلّا کی میراث تو نہیں ہے۔

''مُلّا'' جس وجہ سے قابل گردن زدنی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب سے مرعوب نہیں ہے اور ذہنی غلامی کا کلاوہ اس نے اپنی گردن میں نہیں ڈالا ہے۔ وہ تنگ نظر اور متعصب نہیں ہے کہ آپ مغرب سے واقعی کوئی چیز مفید لائیں اور وہ خواہ مخواہ اس کی مخالفت کرے۔ ملا کو اس بنا پر بھی مجرم ٹھہرایا جارہا ہے کہ اس نے اپنا ایک الگ نظام تعلیم رائج کر رکھا ہے جو اسے قوت واقتدار بہم پہنچاتا ہے۔ اس نظام کے تحت ایک ہزار سال قبل کا مرتب کردہ ''ایک دقیانوسی، فرسودہ اور علمی لحاظ سے افلاس زدہ نصاب پڑھایا جاتا ہے جس کے تمام علوم قیاسی اور ظنی ہیں۔ اس ضمن میں مسلم حکومتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان سب مدارس کو ختم کر کے، حکومتی سرپرستی میں ایسے دارالعلوموں (ماڈل دینی مدارس) کا قیام عمل میں لایا جائے جن میں عصر حاضر کے تقاضوں اور علوم سے باخبر مذہبی رہنما تیار کیے جائیں تاکہ امت مسلمہ میں ''حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا درس دینے والے اور ظلم وجبر کے خلاف سینہ سپر، جہاد آزادی کے متوالوں'' کی تخلیق بند ہوجائے۔

حکومتوں کو یہ مشورہ بھی دیا جارہا ہے کہ تعلیم وتربیت کا پورا نظام براہ راست اُن کی تحویل میں چلایا جائے (البتہ آغا خان بورڈ جیسے تعلیمی غنڈوں کو مسلم امت کو مغرب زدہ کرنے کی کھلی چھوٹ دی جائے) اور کوئی آزاد تعلیمی ادارہ باقی نہ رہے، تاکہ ایک کامل ہمہ گیر ریاست (Total Tarian State) کے مقاصد اچھی طرح پورے ہوسکیں۔ یہ کام فکر ونظر کو جلد دینے کے لیے نہیں بلکہ افکار وجذبات کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لیے درکار ہے۔ اس مغرب زدہ طبقے کو اپنی روشن خیالی پر بڑا ناز ہے مگر وہ اس سادہ سی حقیقت کو بھی جاننے سے قاصر ہے کہ جو قوم اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور ان کی تخلیقی قوتوں کو ابھارنے کا داعیہ رکھتی ہو، وہ شعور واحساس کو زیادہ سے زیادہ آزاد فضا مہیا کرکے اُسے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی دانش مند قومیں اپنے ہاں ہر قسم کے نظام تعلیم کو بشرطیکہ وہ اس کے اساسی تخیل کو برباد کرنے والا نہ ہو، نہ صرف برداشت کرتی ہیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی بڑی بڑی یونی ورسٹیاں اور تعلیمی ادارے حکومت کے اثر سے بالکل آزاد ہیں اور وہ اپنے نہج پر نوخیز نسلوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرتے ہیں۔ ان اداروں کی بیشتر تعداد ایسی ہے جنھیں کلیسا، معابد یا مذہبی تنظیمیں بڑی کامیابی کے ساتھ چلاتی ہیں۔ ان تعلیمی مراکز کو باشعور قومیں اپنے ہاں کے نخلستان سمجھتی ہیں جن میں انسان کو آزادی اور سکون کا ماحول نصیب ہوتا ہے۔ آکسفورڈ نے اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے جتنی قربانی اور جرأت کا ثبوت دیا ہے وہ کسی صاحب علم سے پوشیدہ نہیں۔ تعلیمی جکڑ بندیاں تو دورِ جدید کے آمرانہ رجحانات کے شاخسانے ہیں۔

دینی مدارس اور دارالعلوموں میں مروّجہ نصاب کا ذکر کرکے مغرب زدہ طبقہ جس نفرت اور حقارت کا اظہار کرتا ہے اس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اس طبقے کے اکثر وبیشتر افراد نے اس نصاب کو باقاعدہ پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ دقیانوسی، فرسودہ اور علمی لحاظ سے افلاس زدہ ہے۔ ہم پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں اس طبقہ کا یہ دعویٰ اس نصاب کے بارے میں یکسر بے خبری پر مبنی ہے۔ وہ اس نصاب کی ابجد تک سے بھی ناواقف ہے اور یونہی بے سروپا باتیں کرتا رہتا ہے۔

یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ ہر قدیم چیز فرسودہ اور ہر پرانا نظریہ بے کار ہے۔ حکمت ودانائی کی بات جس طرح کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہیں۔ بالکل اسی طرح یہ کسی خاص عہد کی بھی میراث نہیں۔ پرانے زمانے میں بھی اہل علم نے بعض ایسے افکار اور ایسی تخلیقات پیش کی ہیں جو آج بھی علم وحکمت کی اساس تصور کی جاتی ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈرامے، چاسر، ملٹن، پوپ اور ڈرائیڈن کی نظمیں آج بھی انگریزی ادب کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہیں اور کوئی شخص ان سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کیے بغیر، انگریزی زبان وادب کی نزاکتوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ اسی طرح فلسفے اور سیاسیات میں آج بھی افلاطون اور ارسطو کے نظریات بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یورپی ادب اور حکمت کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا سرچشمہ یونان کے قدیم مفکرین کے تصورات ہیں۔ ''روشن خیال یورپ'' تو انہیں اپنے نصاب میں بطور بنیاد شامل کرکے نوخیز نسلوں کے دل ودماغ پر ان کے نقوش مرتسم کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے، مگر ہم قدیم بات کے محض

اس لیے دشمن ہیں کہ اس کا تعلق ماضی سے ہے۔ اس طرز فکر کا اصل محرک یہ نہیں ہے کہ ہمارے قدیم علوم فرسودہ ہیں بلکہ اس کا اصل مقصود نوجوانوں کے ذہن میں ماضی کے خلاف نفرت پیدا کر کے اُس سے ان کا فکری اور جذباتی رشتہ کاٹ دینا ہے۔ مغربی یونی ورسٹیوں میں اگر شیکسپیئر اور ملٹن کی کتابیں داخل نصاب ہوں اور افلاطون اور ارسطو کے خیالات سے طلبہ کو پوری طرح آشنا کرنے کا انتظام ہو تو یہ روشن خیالی اور عقل پسندی ہے، لیکن دینی مدارس میں جلالین، بیضاوی، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ہدایہ، دیوان حماسہ، دیوان متنبی اور مقامات حریری پڑھانے کا انتظام ہو تو یہ سراسر نہالت ہے!

قیام پاکستان اور اسلام: تحریک پاکستان کا مقصد اسلامی نظام کا قیام اور شریعت کا نفاذ تھا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' اس کا نعرہ تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی انگریز کے جاری کردہ نظام کو اسی طرح ختم کر دیا جاتا جس طرح انگریز نے اسلامی نظام کو ختم کر دیا تھا اور اس کے جاری کردہ نظام تعلیم کو اسلامی نظام تعلیم کے تابع کیا جاتا۔ حکومت کتاب وسنت، فقہ اسلامی اور علوم عربیہ واسلامیہ کا حکومتی سطح پر اہتمام کرتی۔ حکومتی سطح پر دینی مدارس وجود میں آتے۔ اس لیے کہ اسلامی حکومت کا بنیادی فریضہ اسلامی نظام کا نفاذ اور اسلامی تعلیم کا اہتمام کرنا ہے اور یہی ایک اسلامی حکومت کا تشخص ہوا کرتا ہے۔ ایک اسلامی اور غیر اسلامی حکومت میں زبانوں، علوم وفنون، سائنس وٹیکنالوجی، ریاضی اور علم ہیئت، تاریخ وجغرافیہ، طبیعیات، سیاسیات اور معاشیات کی تعلیم میں امتیاز نہیں ہوتا، بلکہ دونوں میں جوہری فرق یہ ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم کا اہتمام کرتی ہے جب کہ غیر اسلامی حکومت اس کا اہتمام نہیں کرتی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد نہ اسلامی نظام نافذ کیا گیا اور نہ اسلامی تعلیم کا سرکاری سطح پر اہتمام کیا گیا۔ وقتاً فوقتاً بننے والے دساتیر میں اسلامی دفعات رکھی گئیں۔ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۵ء کے نافذ دساتیر میں قرار دادِ مقاصد کو دستور میں نافذ العمل جزو بنا دیے جانے کے باوجود کتاب وسنت کو ملک کا سپریم لاء ماننے سے انکار کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ابھی تک عدالتیں اور ادارے شریعت سے آزاد ہیں۔ نیز اسلامی تعلیم کا سرکاری سطح پر کوئی اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ عملاً انگریز کے قائم کردہ نظام اور اس کے جاری کردہ نظام تعلیم کو تحفظ دیا گیا۔

استعمار کے آلہ کار حکمران: استعمار کو اسلامی ممالک سے چلا گیا لیکن اس نے اپنے عرصہ اقتدار کے دوران میں اپنے نظام تعلیم کے ذریعہ ایک ایسا طبقہ تیار کیا جو اس کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہوا جسے اس نے ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں اپنے سیکولر نظام کا گرویدہ بنا لیا اور اس کی روزی اس نظام سے وابستہ کر دی۔

انگریز نے دینی مدارس کے فضلاء کو جاہل قرار دیا۔ علماء دین کے لیے ملازمت کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ان کا نام پڑھے لکھے لوگوں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۷۱ء تک جاری رہا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی پورے ۳۴ سال تک دینی مدارس کی اسناد کی علمی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم

کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ اس نے مغربی استعمار کے شکنجے سے نکالنے کی کوشش کی، لیکن وہ صرف چند اقدامات کر سکے جن میں دینی مدارس کی اسناد کی علمی حیثیت تسلیم کرنا بھی شامل ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ وفاق، تنظیم اور رابطہ وغیرہ کی اسناد کو عملاً قانونی حیثیت ابھی تک نہیں دی جاتی۔ گویا حکومت اس معاملے میں ابھی تک تذبذب کا شکار ہے اور نام نہاد سپر طاقت کا آلہ کار بن کر دینی مدارس کے اصل تشخص کا حلیہ بگاڑنا چاہتی ہے۔

موجودہ سیاسی دباؤ کا پس منظر: انگریز کا مراعات یافتہ طبقہ اور تیار کردہ طبقہ جو علماء دین کو قید و بند اور اذیتوں سے دوچار کرنے میں انگریز کا آلۂ کار تھا، آج انگریز کے جانشین کے طور پر ملکی نظام پر قابض ہے۔ یہ گروہ انگریز سے بڑھ کر اسلام کی راہ میں رکاوٹ اور اس سے بڑھ کر دینی مدارس اور اسلامی تحریکات کو کچلنا چاہتا ہے۔ ایک معاصر محقق کا یہ بیان بہت چشم کشا ہے:

> ''جنگ عظیم دوم کے بعد مسلم عوام کا اضطراب بڑھنے لگا، یہ اضطراب معرکۂ خلیج کے خاتمے اور نیو ورلڈ آرڈر کے قیام پر اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس اضطراب کی بنیادی وجہ وہ حملے تھے جو خلافت اسلامیہ کے خاتمے کے بعد مسلسل ان کی حمیت، دینی غیرت اور اسلامی تشخص پر ہوتے رہے۔ جن سے ان کی ملّی امنگوں کا خون ہوتا رہا۔ ان تمام تکلیف دہ تبدیلیوں کا بنیادی سبب، ان کے نزدیک مسلم ملکوں کی قیادت تھی۔ اس قیادت کی اکثریت فریب خوردہ، شکست خوردہ، بے نشاط اور مایوس ہو کر بزدل اور خود غرض ہو چکی تھی۔ ان کی اکثریت اسلامی فکر کے اعتبار سے معطل اور سیکولرائزڈ تھی۔ چنانچہ استعماری قوتوں کے مسلم ملکوں سے بظاہر رخصت ہو جانے کے باوجود ان کی فکری استعماریت نہ صرف علی حالہ برقرار رہی بلکہ اب خود نام نہاد مسلم قیادت کے ہاتھوں زیادہ وحشیانہ طریقے سے ترقی کرتی رہی۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہودیت کو ہوا۔ وہ انیسویں اور بیسویں صدی کے نصف اول کے مقابلے میں زیادہ محفوظ و مامون ہو گئی اور سب سے بڑا نقصان مجموعی طور پر امت مسلمہ کو ہوا جس کی قوت، ملت کی سطح پر بٹ کر ملت کے خلاف ہی استعمال ہونے لگی۔ مسلم ممالک کی قیادت نے اپنے ہی عوام کو بربریت سے کچلنا شروع کر دیا اور عوام اپنی قیادت سے نفرت کرنے اور انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد کرنے لگے۔ یہودیت کی جارحانہ پیش قدمی جاری رہی، اس لیے کہ ان کی بالواسطہ لڑائی مسلم حکومتوں کی قیادتیں لڑ رہی تھیں۔ ماضی قریب کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلم ملکوں میں یہودی اپنی لڑائی شاید اتنی بربریت سے خود نہ لڑ پاتے جیسی ان کے لیے مسلم قیادت نے لڑی''۔

(''عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال'' از: جناب اسرار عالم، ص ۳۵۵، ۳۵۴)

علماء نے انگریزی استعمار کو شکست دی۔ اس کے بعد اس کے جانشین سیکولر گروہ جو انگریزی نظام حکومت و نظام تعلیم کا محافظ بنا ہوا ہے کو پے در پے شکست سے دوچار کیا۔ قیام پاکستان کے بعد اسلام اور سیکولرازم اور سوشلزم کی کشمکش میں

اسلام کو فتح اور سیکولرازم اور سوشلزم کو شکست ہوئی۔ قراردادِ مقاصد، دستور کی اسلامی دفعات ۶۲، ۶۳، اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان جو آئین پاکستان کے تحت قائم ایسا ادارہ ہے جس کا کام معاشرے کو اسلامی بنانے کے لیے سفارشات پیش کرنا اور ایسے قوانین جو خلاف اسلام ہیں، ان کی جگہ اسلام کے قوانین ترتیب دینا ہے۔ اس کی سفارشات اسلام کے علم برداروں کی فتح اور مغرب اور لادینیت کے نمائندوں کی شکست ہے۔ اس وقت مغرب دینی مدارس کے خلاف پورے زور وشور سے اس لیے پروپیگنڈہ مہم چلا رہا ہے کہ اسے نظر آ رہا ہے کہ اس وقت تمام دینی مدارس باطل قوتوں کے سامنے سینہ سپر اور اقامت دین کے نصب العین پر متحد ہیں۔ عوام ان کے ساتھ ہیں۔ مذہب اور سیاست کی جدائی کا نظریہ مر چکا ہے۔ دینی مدارس علمی میدان میں جہاد کر رہے ہیں اور عوام کو ذہناً اسلامی انقلاب کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ پبلک کو غلبہ اسلام کے لیے تیار اور احیائے اسلام کی تحریک کے گرد جمع کر رہے ہیں۔ مغرب کو نظر آ رہا ہے کہ اسلامی احیاء کی تحریک اور دینی مدارس کی فوج اقتدار کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اس بنا پر مغرب خوف زدہ ہے اور وہ مدارس کے خلاف مکروہ پروپیگنڈہ اور سازشیں کر رہا ہے تاکہ وہ اسے اقتدار سے دور رکھنے میں کامیاب ہو سکے۔

(جاری ہے)

علم کا شوق

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سفر حج میں تھے اس سفر میں آپ کا جہاز ایک بندرگاہ پر ٹھہر گیا۔ مولانا کو معلوم ہوا کہ یہاں جہاز چند روز قیام کرے گا چونکہ آپ کو معلوم تھا کہ یہاں سے قریب کسی بستی میں ایک معمر عالم اور محدث رہتے ہیں۔ اس لیے آپ جہاز سے اتر کر ان کی خدمت میں روانہ ہو گئے جب ان کی خدمت میں پہنچے اور گفتگو ہوئی، تو مولانا کو ان کی شہرت علم کی تصدیق ہو گئی اور آپ نے ان سے حدیث کی سند کی درخواست کی۔

ان عالم صاحب نے دریافت کیا کہ ''تم نے کس سے حدیث پڑھی ہے'' مولانا نے فرمایا: ''شاہ عبدالغنی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے''۔ وہ عالم شاہ صاحب کو نہ جانتے تھے اس لیے پوچھا کہ ''انھوں نے کس سے پڑھی ہے''۔ مولانا نے فرمایا: ''شاہ اسحٰق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے''۔ وہ شاہ اسحٰق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی واقف نہ تھے، اس لیے پوچھا کہ: ''شاہ اسحٰق صاحب نے کس سے پڑھی ہے''۔ مولانا نے فرمایا: ''شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے''۔ وہ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے واقف تھے جب ان کا نام سنا تو فرمایا کہ: ''اب میں تم کو سند دے دوں گا'' اور یہ بھی فرمایا کہ ''شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے پس جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں یوں ہی جہاں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں وہاں جنت نہیں''۔ اس کے بعد انھوں نے مولانا کو حدیث کی سند دیدی۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ باوجود کامل ہونے کے دوسرے اہل کمال سے استفادہ فرمانا کمال تواضع وحرص دین کی دلیل ہے۔

(''پرچھائیاں''، ص ۵۶، جمع وترتیب: محمد سعد)